

اردو غزل کے فروغ میں ماہنامہ ”قومی زبان“ کراچی کا حصہ

The Contribution of Monthly "Qaumi Zaban" Karachi in the Promotion of the Urdu Ghazal

Muhammad Shahbaz Faridi

PhD Scholar Department of Urdu,
Riphah International University, Faisalabad Campus

Dr. Jameel Asghar

Head of Department Urdu,
Riphah International University, Faisalabad Campus

محمد شہباز فریدی

پی ایچ ڈی اسکالر شعبہ اردو، رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی، فیصل آباد کیمپس

ڈاکٹر جمیل اصغر

صدر شعبہ اردو رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی، فیصل آباد کیمپس

Abstract

This article presents an overview of the definition, evolution, and semantic breadth of the Urdu ghazal, explaining that the ghazal is not merely a poetic form but an effective and subtle medium for expressing human inner states, emotions, thought, mysticism, politics, sociology, and existential questions. The article highlights the importance of the ghazal through references to Rashid Ahmed Siddiqui and Rafiuddin Hashmi. Furthermore, the monthly journal "Qaumi Zaban" is given a key role in the promotion of the Urdu ghazal, as it has enriched this genre academically and literarily by publishing research and critical articles. Moreover, the article presents an analysis of the poetry of three major poets Saba Akbarabadi, Qateel Shifai, and Nasir Kazmi whose ghazals prominently feature themes such as mysticism, social consciousness, political awareness, the sorrow of migration, loneliness, and hope. Thus, this paper highlights the cultural, intellectual, and artistic tradition of the Urdu ghazal, establishing it as a living and dynamic literary genre. The article concludes that all these articles published in "Qaumi Zaban" are of immense significance for the promotion of Urdu ghazal and the broader development of Urdu literature.

Keywords: Urdu Ghazal, Qaumi Zaban, Literary Genre, Mysticism, Social Consciousness, Political Awareness, Existentialism, Saba Akbarabadi, Qateel Shifai, Nasir Kazmi, Migration, Loneliness, Hope, Urdu Poetry

کلیدی الفاظ: اردو غزل، قومی زبان، ادبی صنف، تصوف، سماجی شعور، سیاسی آگہی، وجودیت، صبا اکبر آبادی، قتیل شفائی، ناصر کاظمی، ہجرت، تنہائی، امید، اردو شاعری

غزل کی تعریف محض چند شعروں پر مشتمل ایک قالب تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی ادبی صنف ہے جس میں انسان اپنی داخلی کیفیات کو سب سے زیادہ لطیف اور فصیح پیرایے میں پیش کرتا ہے۔ غزل میں موضوعاتی یک رنگی کے باوجود معنوی تنوع اس قدر وسیع ہے کہ اس کی ہر جہت انسانی تجربے کے ایک نئے زاویے کو منکشف کرتی ہے۔ جذباتی نرمی، فکری گہرائی، زبان کی لطافت، صوتی توازن، استعاراتی تہہ داری اور علامتی وسعت یہ تمام عناصر مل کر غزل کو ایک مثالی شعری ہیئت بناتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہتے ہیں:

”غزل کو میں اردو شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں۔ ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں

ڈھلی ہے۔ دونوں کو سمت و رفتار، رنگ و آہنگ، وزن و قاریک دوسرے سے ملا ہے۔“⁽¹⁾



غزل کو مرکزی طور پر عاشقانہ جذبات کا اظہار سمجھا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے شعری ڈھانچے میں عشق کے موضوع کے ساتھ ساتھ فلسفہ، اخلاقیات، تصوف، سیاست، سماجیات، وجودیت، تنہائی، شکست آرزو، سوال ہستی اور کائناتی شعور جیسے عناصر بھی پوری معنوی توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

”غزل اردو کی مقبول ترین صنفِ شعر ہے۔ غزل کے لغوی معنی عورتوں یا عورتوں کے متعلق گفتگو کرنا ہیں۔ ہرن کے منہ سے بوقتِ خوف جو درد ناک چیخ نکلتی ہے جس میں حسن و عشق کی مختلف کیفیات کا بیان ہو اور اس میں درد و سوز بہت نمایاں ہو۔ اصطلاحاً غزل کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ غزل کے ہر شعر میں ایک مکمل مفہوم ادا ہوتا ہے۔ ہر شعر اپنا اپنا الگ مفہوم دیتا ہے۔“ (۲)

اردو غزل کے فروغ میں ماہنامہ ”قومی زبان“ اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ ماہنامہ ”قومی زبان“ اردو ادب کی دنیا میں ایک معتبر اور خاص اہمیت کا حامل رسالہ ہے جو اپنی اشاعت کے آغاز یعنی 1948ء سے تاحال اردو زبان و ادب کی خدمت میں مصروفِ عمل ہے۔ یہ جریدہ خصوصاً اردو غزل کے موضوع پر اعلیٰ پائے کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین شائع کرتا ہے۔ ان تحریروں میں قدیم و جدید شعر کے کلام کو شامل کیا جاتا ہے اور مصنفین اپنے مباحث میں شاعری کے خوبصورت پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے مناسب مواقع پر شعری مثالیں بھی پیش کرتے ہیں۔

اس جریدے میں غزل کے متنوع موضوعات پر مفصل اور با معنی گفتگو کی جاتی ہے جو قارئین کے لیے علمی، ادبی اور ذوقی لحاظ سے انتہائی مفید ثابت ہوتی ہے۔ کبھی کبھار مختلف اشاعتوں میں متعدد شاعروں کے کلام میں سے پوری پوری غزلیں اور نظمیں بھی شائع کی جاتی ہیں جبکہ بعض مضامین میں صرف چند اشعار بہ طور مثال پیش کیے جاتے ہیں تاکہ گفتگو کو واضح کیا جاسکے۔ اس طرح ماہنامہ ”قومی زبان“ معیاری ادبی مواد کی فراہمی کے ذریعے اردو ادب کے فروغ میں کلیدی کردار ادا کر رہا ہے۔ اردو غزل اردو ادب کی ایک ایسی جامع، موثر اور ہمہ گیر صنف ہے جو نہ صرف جذبات، احساسات اور انسانی کیفیات کے لطیف پہلوؤں کو اپنے دامن میں سمیٹتی ہے بلکہ اس میں اردو زبان کی ثقافتی پیچان، فکری میراث اور فنکارانہ حس کی ایسی تصویر بھی موجود ہے جو صدیوں کے سماجی، معاشرتی اور ادبی ارتقا کا عکس پیش کرتی ہے۔ یوں غزل محض ایک صنف نہیں بلکہ انسانی شعور کے جمالیاتی اظہار کا وہ دائمی اسلوب ہے جو زمانے کی تبدیلیوں سے متاثر ضرور ہوتا ہے مگر اپنی اساس اور فنکارانہ شان برقرار رکھتا ہے۔

اردو غزل کا آغاز بنیادی طور پر اردو زبان کی تشکیل و ارتقا کے تاریخی عمل سے گہرا مربوط ہے۔ جس طرح اردو زبان نے مختلف لسانی اور ثقافتی مراحل طے کرتے ہوئے اپنی موجودہ شکل اختیار کی ہے اسی طرح غزل نے عربی، فارسی اور مقامی ہندوستانی ادبی روایات کے امتزاج سے پروان چڑھنا شروع کیا۔ دکنی زبان کے ابتدائی شعرا کے ہاں غزل کی ہیئت اپنی سادگی کے ساتھ موجود تھی اور ولی دکنی نے اسے شمالی ہند میں منتقل کر کے اسے وہ بنیاد عطا کی جس پر بعد میں پوری عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ ولی نے غزل میں فارسی روایت کے جمالیاتی اصول شامل کیے اور اردو غزل کا پہلا باقاعدہ سنگ میل قائم ہوا۔ میر تقی میر نے غزل کو وہ داخلی کرب، سوز، محبت کی لطافت اور انسانی دکھ کا اظہار دیا جس نے غزل کو محض شعر کی صنف نہیں بلکہ انسانی تجربے کی زبان بنا دیا۔ میر کے ہاں غم جانا اور غم دوراں دونوں اپنی پوری سچائی کے ساتھ جلوہ گر ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں غزل ایک فرد کے ذاتی دکھ سے اٹھ کر اجتماعی انسانی ایسے کی ترجمان بنتی ہے۔ غالب نے غزل میں فکر کی گہرائی، استعاراتی پیچیدگی، فلسفیانہ رنگ اور ذہنی تجرید کا ایک نیا باب کھولا جس سے غزل کی معنوی سمت وسیع تر ہو گئی۔

غزل کی روایتی ہیئت میں ردیف، قافیہ اور غزل کی موسیقیت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ غزل میں ہر شعر اپنی جگہ مکمل کلام ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت غزل کو ایک ایسی ہیئت بناتی ہے جس میں موضوع کی وسعت اور فکری تنوع کے باوجود شعری آہنگ برقرار رہتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ غزل نے نہ صرف اپنی لسانی ساخت کو برقرار رکھا ہے بلکہ نئے موضوعات، تجربات اور اسلوب بھی جذب کیے ہیں۔ جدید دور میں فیض احمد فیض نے غزل میں سیاسی شعور، انقلابی فکر اور اجتماعی دکھ کو شامل کیا ہے جس سے غزل کے امکانات مزید وسیع ہوئے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی نے دیہی زندگی، انسانی محبت اور سماجی تضادات کو غزل کا حصہ بنایا ہے جب کہ فراق گورکھپوری نے غزل میں رومانیت اور جمالیات کا ایک نیا زاویہ متعارف کرایا ہے۔ یوں غزل کا ارتقا محض تکنیکی تبدیلی نہیں ہے بلکہ ثقافتی، فکری اور سماجی ارتقا کی ایک زندہ تاریخ ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری رقم طراز ہیں:

”غزل گوئی اردو شاعری کی سب سے اہم اور معتبر روایت ہے۔ اتنی معتبر و اہم کہ اگر اسے اردو

شاعری کے ایوان سے خارج کر دیا جائے تو اس کی فضا سردہ اور بے جان نظر آنے لگے گی۔“ (۳)

غزل کی روایت میں تصوف کا رنگ نہایت نمایاں ہے۔ عشق حقیقی اور عشق مجازی کی آمیزش نے غزل کو معرفت کا وہ آہنگ عطا کیا ہے جو اسے محض شاعری نہیں بلکہ باطنی تجربے کی زبان بنا دیتا ہے۔ میر اور غالب کے ہاں یہ رنگ لطیف اور گہر ادونوں صورتوں میں موجود ہے جب کہ اقبال کے یہاں غزل کو ایک نیا فکری تصور ملا ہے۔ اقبال کی غزل نے اردو غزل کو محض عشق و محبت کے بیان تک محدود نہیں رہنے دیا ہے بلکہ اسے قوموں کی روحانی و فکری بیداری کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ بعد ازاں جدید شعر نے غزل میں وجودی اضطراب، تنہائی، شناخت کے بحران اور سیاسی جبر کے خلاف مزاحمت جیسے موضوعات کو شامل کر کے غزل کو دور حاضر کی فکری دھڑکن سے جوڑ دیا ہے۔ یوں غزل روایت کے تسلسل کے ساتھ ساتھ تجربے کی تازگی کا بھی نام ہے۔

اردو غزل کی اہمیت و افادیت صرف اس بات میں نہیں کہ یہ ایک مقبول صنف ہے بلکہ اس میں ہے کہ یہ اردو زبان کی فکری اور تہذیبی بنیادوں کو مستحکم کرتی ہے۔ غزل نے زبان کو نہ صرف لطافت، موزونیت اور صوتی ہم آہنگی عطا کی ہے بلکہ اسے معنوی تہہ داری، محاوراتی ثروت اور جمالیاتی حسن بھی دیا ہے۔ غزل کے باعث اردو زبان کا لغوی سرمایہ وسیع ہوا، نئی تراکیب وضع ہوئیں، الفاظ کو نئے معانی ملے اور زبان اپنے اندر ایسی چمک پیدا کرنے میں کامیاب ہوئی جو اسے ہر دور کے اظہار کے قابل بناتی ہے۔ غزل کے ذریعے قاری زبان کے جمال اور معنی دونوں کا تجربہ کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ غزل نے اردو زبان کو زندہ، متحرک اور ہمہ گیر رکھا ہے۔

فروع ادب اردو میں غزل کی خدمات بے شمار ہیں۔ غزل نے اردو شاعری کو عالمی سطح تک پہنچایا ہے اسے ادبی کانفرنسوں، نصابی مباحث، نغمگی، موسیقی، غنائیت اور تنقید سب کی بنیاد بنایا ہے۔ غزل کی وجہ سے اردو ادب کو وہ پہچان ملی جو اسے دنیا کی بڑی زبانوں کے ادب میں نمایاں مقام پر لے آئی ہے۔ غزل نے اردو شاعری کو مقبولیت اور دوام دونوں عطا کیے ہیں۔ غزل کی روایت نے لکھنے والوں کو نئے انداز میں سوچنے، تخلیق کرنے اور زبان کو نیا جمال دینے کا حوصلہ دیا ہے۔ اس صنف نے نہ صرف بڑے شعر اپید کیے ہیں بلکہ بڑے ناقد، محقق اور اسلوبیات کے ماہرین بھی پیدا کیے ہیں۔ غزل نے تنقیدی روایت کو بھی مضبوط کیا کیونکہ اس کی معنوی پیچیدگی اور تہ داری نے نقاد کو نظریاتی اور فنی سطح پر متنوع زاویوں کی طرف متوجہ کیا ہے۔

علامتی اردو غزل کا سفر محض شعری روایت کا نہیں بلکہ ایک تہذیبی سفر ہے۔ یہ صنف داخلی وجدان، روحانی تجربے، جذباتی شدت، ملک فکری تنقید گہرائی اور جمالیاتی نزاکت کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ایک ایسی متحرک ادبی ساخت میں ڈھل چکی ہے جو ہمارے اجتماعی شعور کا حصہ بن

چکی ہے۔ اس کی مسلسل حیات اور دیرپا مقبولیت اس بات کی دلیل ہے کہ اُردو غزل نہ صرف ماضی کی علامت ہے بلکہ آج کے فکری اور جمالیاتی مکالمے کا بھی بنیادی محور ہے۔ اُردو غزل کے حوالے سے ماہنامہ ”قومی زبان“ کے رسائل میں متعدد مضامین شائع ہوئے ہیں۔ تحقیقی و تنقیدی مضامین کے ساتھ ساتھ شعر کا کلام بھی شائع کیا گیا ہے۔

صبا اکبر آبادی (ایک مطالعہ):

ماہنامہ ”قومی زبان“ کراچی کے جون 2009ء کے شمارے میں عبد اللہ جاوید کا تحریر کردہ مضمون ”صبا اکبر آبادی (ایک مطالعہ)“ شامل ہے۔ اس مضمون میں صبا اکبر آبادی کے حالاتِ زندگی اور کلام کا خصوصی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مصنف اس مضمون میں صبا اکبر آبادی کی ایک خاص قسم کی غزل کا ذکر کر رہے ہیں جسے ”مسلسل غزل“ کہا جاتا ہے۔ اس غزل میں شاعر خود اپنا تعارف کر رہے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اپنی زندگی کے اہم واقعات یا کیفیتوں کو مختصراً قلمبند کر رہے ہوں۔ گویا یہ پوری غزل ان کی خود نوشت کا پیرایہ اختیار کرتی ہے جس میں ان کی زندگی کی جھلکیاں نمایاں ہیں۔ مصنف کے مطابق شاعر اس بات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں کہ وہ زمانے کے ساتھ چلنے والے یا حالات کے مطابق ڈھل جانے والے انسان نہیں ہیں۔ انھوں نے موقع پرستی کو اپنا شیوہ نہیں بنایا اور نہ ہی دنیا داری کی خاطر اپنے اصولوں سے سمجھو تا کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انھوں نے زندگی بھر اقدار کو تھامے رکھا۔ نمونے کے طور پر کلام موجود ہے:

مے تلخِ ضعیفی پی رہا ہوں
 جوانی کی سزا میں جی رہا ہوں
 غمِ انسانیت رکھا ہے دل میں
 نظامِ جبر کا باغی رہا ہوں
 زمانے نے مجھے بدلا نہیں ہے
 کہ میں جیسا تھا، ویسا ہی رہا ہوں^(۴)

اس شعر میں شاعر کو صرف جلنے والی چیز کے طور پر نہیں دیکھا بلکہ اسے ایک صوفی کامل کی علامت بنا دیا ہے۔ شاعر کی یہ صوفیانہ جرأت دیکھیے۔ لکھتے ہیں:

اپنے جلنے میں کسی کو نہیں کرتے ہیں شریک
 رات ہو جائے تو ہم شمع بجھا دیتے ہیں^(۵)

اس شعر میں شاعر کا بصری ادراک ملاحظہ کریں:

جس نے اللہ کو دیکھا ہو گا
 کوئی اللہ کا بندہ ہو گا^(۶)

مصنف کے مطابق صبا اکبر آبادی عملی تصوف کے آدمی ہیں۔ ان کا تعلق تصوف کے گھرانے سے ہے:

ہمیں مکاشفہ ذات سے جو ہو فرصت
 تو شرحِ منکشف و کشف و انکشاف کریں
 جو رازِ تابہ زباں آئے زباں جل جائے

اس ایک راز کا ہم کیسے انکشاف کریں^(۷)
مصنف کے نزدیک مکاں کی جگہ مکین سے رشتہ کا معاملہ تو پہلے آچکا ہے اس کی مزید وضاحت دیکھیں:
میخانہ ہو، بت خانہ ہو، مسجد ہو کہیں ہو
آنکھوں کو تجلی سے سروکار ہے بابا^(۸)
وہ کہتے ہیں کہ شاعر کے ہاں تصوف پایا جاتا ہے۔ تصوف کا رخ ملاحظہ ہو:

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں^(۹)
مضمون نگار کے مطابق شاعر کا اپنا انداز ہے اور وہ انداز بے نیازانہ ہے:

دنیا سے ہوں یوں راحتِ دنیا کا طلب گار
جیسے کوئی سائل در سائل پہ صدا دے^(۱۰)
وہ کہتے ہیں کہ شاعر کی والہانہ وارفتگی نے محبوب کو بگاڑ دیا ہے:

عاداً وہ خفا رہے ہم سے
دفعاً آگئی ہنسی تو کیا^(۱۱)
وہ بتاتے ہیں کہ شاعر روایتی عاشقوں کی مانند جب آئینہ دیکھتے ہیں تو ان کے محبوب کا عکس نظر آتا ہے:
آئینے میں بھی ان کا جلوہ تھا
اپنی صورت کہاں نظر آئی^(۱۲)
مصنف لکھتے ہیں کہ صبا اکبر آبادی اپنے محبوب سے التجا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

در و دیوار مجھ کو طعنے دے
یوں نہ جاؤ غریب خانے سے^(۱۳)
مصنف کہتے ہیں کہ شاعر اس شعر میں دیکھیے تو کیا کہہ رہے ہیں اور کس انداز میں مخاطب ہیں:

دل ہی تو ہے بدلنا تھا، آخر بدل گیا
کل چاہتا تھا، آج نہیں چاہتا ہوں میں^(۱۴)
مصنف کے مطابق شاعر آگے چل کر مزید کھل کر کہتے ہیں:

وہ دن بھی تھے کہ صرف محبت تھی اور دل
اب داغ رہ گیا ہے، محبت نہیں رہی^(۱۵)

مضمون نگار کے مطابق صبا اکبر آبادی کا شمار اردو زبان کے نامور شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ صحافت، ترجمہ نگاری اور ناول نگاری جیسے متنوع شعبوں سے بھی وابستہ رہے تاہم ان کی اصل شہرت کا سبب شاعری خاص کر نعت اور مرثیہ گوئی ہے۔ مصنف نے بتایا ہے کہ صبا اکبر آبادی کی لسانی

صلاحیتوں اور اظہار و بیان کے فن پر ان کی مکمل دسترس کے بارے میں بہت سے ناقدین نے رائے دی ہے۔ سوانحی عمری کے مطابق خواجہ امیر صبا اکبر ۱۳ اگست ۱۹۰۸ء کو اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔ اس تناظر میں مصنف رقم طراز ہیں:

”صبا اکبر آبادی 14 اگست 1908ء کو برطانوی ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ان کا پیدائشی نام خواجہ محمد امیر تھا۔ انھوں نے 1920ء میں شاعری کا آغاز کیا اور خادم علی خاں اخضر اکبر آبادی سے فن شاعری میں اصلاح لی۔ 1927ء میں وہ شاہ اکبر داناپوری کے فرزند شاہ محسن داناپوری کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے، جس سے ان کا تصوف سے گہرا تعلق استوار ہوا۔ 1928ء میں انھوں نے ماہنامہ ”آزاد“ جاری کیا اور بعد میں رعنا اکبر آبادی کے رسالے ”مشورہ“ کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔“ (۱۶)

انھوں نے بتایا ہے کہ صبا اکبر آبادی نے تقسیم ہند کے بعد حیدرآباد (سندھ) اور بعد ازاں کراچی میں سکونت اختیار کی جہاں وہ جلد ہی ادبی حلقوں کا اہم حصہ بن گئے۔ اس دوران انھوں نے مختلف قسم کی ملازمتیں بھی کیں۔ وہ کہتے ہیں کہ صبا اکبر آبادی کے کئی شعری مجموعے شائع ہوئے جن میں اوراق گل، سخن ناشیدہ، ذکر و فکر، چراغ بہار، خوناب، حرز جاں، ثبات اور دست دعا شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے مرثیوں کے تین مجموعے سر بکف، شہادت اور قرطاس الم کے نام سے شائع ہوئے۔

قتیل شفائی کی بے باک غزل گوئی:

رسالہ ”قومی زبان“ کے اکتوبر 1998ء کے شمارے میں ڈاکٹر ثار احمد فیض کا تحریر کردہ ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ”قتیل شفائی کی بے باک غزل گوئی“ ہے۔ اس مضمون میں اردو کے شاعر قتیل شفائی کی غزلیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مضمون نگار کے مطابق قتیل شفائی کے فن غزل گوئی کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کی غزل تین بنیادی پہلوؤں یعنی اسلوب، الفاظ کے چناؤ اور موضوعات کے اعتبار سے ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ اس تناظر میں مصنف رقم طراز ہیں:

”جہاں تک قتیل کی غزل گوئی کا سوال ہے ان کی غزل اسلوبیات، لفظیات اور موضوعات تینوں اعتبار سے ایک انفرادی اہمیت کی حامل ہے۔ لفظیات کے برتاؤ میں قتیل نے اپنی الگ ایک راہ نکال لی ہے جو دیگر شاعروں کو کم ہی میسر ہے۔ اسلوب بھی نہایت سادہ اور سلیس ہے۔ کسی قسم کا الجھاؤ اس میں نہیں اور موضوع وہی عوامی مشکلات اور ان کے مسائل ہیں۔“ (۱۷)

مضمون نگار کے مطابق 1938ء میں انھوں نے ”قتیل شفائی“ کو قلمی نام بنایا۔ ”قتیل“ تخلص تھا جبکہ ”شفائی“ اپنے استاد حکیم محمد یحییٰ شفا کا پوری کی نسبت سے شامل کیا۔ 1935ء میں والد کے انتقال کے بعد اعلیٰ تعلیم ترک کرنا پڑی۔ کھیلوں کے سامان کی دکان کھولی مگر ناکام رہے پھر راولپنڈی جا کر ٹرانسپورٹ کمپنی میں ملازمت کی۔ 1947ء میں فلمی نغمہ نگاری کا آغاز کیا۔ والد تاجر تھے اور گھر میں شعری ماحول نہ تھا۔ ابتدا میں حکیم یحییٰ شفا سے اصلاح لی، پھر احمد ندیم قاسمی کے شاگرد بن گئے۔

وہ بتاتے ہیں کہ قتیل شفائی عوامی سطح پر مقبول شاعر تھے۔ ان کی شاعری کی پذیرائی کا سبب ان کا سادہ اور حقیقی لہجہ، عام فہم زبان اور عوامی جذبات کی ترجمانی ہے۔ مختلف اصناف شاعری میں طبع آزمائی کے باوجود غزل ان کا اصل میدان رہا۔ ان کے کلام میں معاشرتی اور سیاسی شعور نمایاں ہے اور ان کا شمار ترقی پسند شعرا کے اولین صف میں ہوتا ہے۔ فلمی نغمہ نگاری میں بھی نمایاں مقام رکھتے ہیں اور ان کا کلام پاکستان اور

بھارت دونوں میں یکساں مقبول ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قتیل شفقانی نے اپنی شاعری کے ذریعے عوام میں ضمیر کی بیداری، اپنی پہچان اور خود مختاری کا جذبہ پیدا کیا۔ انھوں نے مظالم برداشت کرنے والوں کو کبھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ نمونہ کلام درج ہے:

چاہے وہ کوئی ہو مرا فتویٰ ہے اے قتیل
ظالم سے انتقام ستم لینا چاہیے
دنیا میں قتیل اس سا منافق نہیں کوئی
جو ظلم تو سہتا ہے بغاوت نہیں کرتا (۱۸)

وہ لکھتے ہیں کہ قتیل شفقانی نے اپنی شاعری میں انسان کے اندر سے معدوم ہوتی ہوئی انسانیت پر اظہارِ افسوس کیا ہے:

ان دنوں خلق خدا کے ڈر سے
میں نکلتا نہیں اپنے گھر سے (۱۹)

مضمون نگار کے مطابق قتیل شفقانی کی شاعری میں احساس کا درد بڑی شدت سے ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اب وہ خوابوں کی بستی اجڑ چکی ہے اب ہر طرف رقص کرتی تتلیوں کے پربکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ گزرے دنوں کی خوشبو ان کے بدن میں بسی ہوئی ہے:

صبح گلشن کا یہ عالم تھا کہ جب آندھی رُکی
ہر طرف بکھرے ہوئے کچھ تتلیوں کے پر ملے (۲۰)

مضمون نگار کے مطابق قتیل شفقانی نے اس شعر میں ایک تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس دنیا میں محبت کے پیچھے ہزاروں طرح کے راز پوشیدہ ہیں۔ شاید قتیل شفقانی نے کسی سے محبت کی ہو لیکن قتیل کی غربت ملتے ہی وہ لڑکی ان کے خوابوں کی بستی میں آگ لگا کر اپنی دنیا بسا لیتی ہے:

کیسے کیسے بھید چھپے ہیں پیار بھرے اقرار کے پیچھے
کوئی پتھر تان رہا ہے، شیشے کی دیوار کے پیچھے (۲۱)

محبت تھی اسے لیکن مرا افلاس جب دیکھا
پریشاں سی نظر آئی وہ نازوں کی پٹی مجھ سے (۲۲)

آخر میں مضمون نگار لکھتے ہیں کہ قتیل کی شاعری اس مؤذن کی اذان کی طرح ہے جو خواب غفلت میں سوئے ہوئے انسان کو بیدار کر دیتی ہے۔ قتیل مؤذن کا کام کر رہے ہیں۔ اب قاری کی ذمہ داری ہے کہ وہ جاگ کر پھر نہ سو جائے:

مؤذن کی اذان برحق ہے لیکن
نمازی جاگ کر پھر سو گیا تو (۲۳)

مذکورہ بالا مضمون پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اُردو شاعری کے فروغ میں اہمیت کا حامل ہے۔

ناصر کاظمی کی غزلیات کے مقطعوں کا جائزہ:

رسالے ”قومی زبان“ کے شمارہ جون 2009ء میں شاملہ یاسمین کا لکھا ہوا ایک مضمون شامل ہے جس کا عنوان ”ناصر کاظمی کی غزلیات کے مقطعوں کا جائزہ“ ہے۔ اس مضمون میں ناصر کاظمی کی غزلیات کے مقطعوں کا بھرپور جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ناصر کاظمی قادر الکلام تھے۔ ان کی شاعرانہ خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے مصنفہ رقم طراز ہیں:

”ناصر کی غزلیات کا ہر شعر ایک جداگانہ اکائی کا حامل ہے۔ اور باطنی سطح پر بھی ایک انفرادی

حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی غزلیات کے مقطعوں میں ہمیں ان کے ذاتی تجربات و مشاہدات اور ذہنی و

فکری رجحانات کا سراغ ملتا ہے۔“ (۲۴)

مضمون نگار کے مطابق ناصر کاظمی 8 دسمبر 1925ء کو بھارت کے شہر انبالہ میں پیدا ہوئے۔ ناصر کاظمی آزادی کے فوراً بعد پاکستان تشریف لائے اور لاہور میں سکونت پذیر ہوئے۔ کچھ ہی عرصے میں انہیں اپنے والدین کے انتقال کا صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا۔ انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ادبی جریدے ”اوراق نو“ کی ادارت سے کیا اور 1952ء میں ”ہمایوں“ نامی رسالے سے وابستہ ہو گئے۔ وہ تحریر کرتے ہیں کہ ناصر کاظمی کے غزلیہ مجموعوں میں ”برگ نے“، ”دیوان“ اور ”پہلی بارش“ شامل ہیں جبکہ ”نشاطِ خواب“ ان کا شعری مجموعہ ہے۔ مارچ 1972ء میں ناصر کاظمی کا انتقال ہو گیا۔

مضمون نگار کے مطابق ناصر کاظمی غم کی لے اور یاد کا شاعر ہے۔ ان کو ہجرت کا بہت دکھ تھا۔ نمونہ کلام درج ہے:

جنہیں ہم دیکھ کر جیتے تھے ناصر
وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے (۲۵)

وہ کہتے ہیں کہ ناصر اپنی یادوں کو جب حقیقت کے آئینے میں دیکھتے ہیں تو انہیں عذاب جان کہے بغیر نہیں رہ سکتے:

زندگی جس کے دم سے ہے ناصر
یاد اس کی عذاب جان بھی ہے (۲۶)

وہ بتاتے ہیں کہ یوں ناصر نے اپنی یادوں کے پھول کھلائے رکھے ہیں:

سوکھے پتوں کو دیکھ کر ناصر
یاد آتی ہے گل کی باس بہت (۲۷)

مضمون نگار کے مطابق ناصر کاظمی کی شاعری میں سفر کا بیان ایک اہم موضوع ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ ناصر کاظمی نے اپنی غزلوں کے کئی مقطعوں میں سفر، راستے، مسافر، منزل وغیرہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ مثلاً:

رودادِ سفر نہ چھیڑ ناصر
پھر اشک نہ تھم سکیں گے میرے (۲۸)

مصنف کے نزدیک اس شعر میں ناصر کی اداسی نے سب کو اداس کر دیا ہے اور پھر ان کی ذات کی اداسی ارد گرد کے ماحول میں پھیل گئی ہے:

دل تو میرا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے (۲۹)

مضمون نگار کے مطابق کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یاد آنے والے نے اپنی یادوں کا شدید احساس دلایا کہ ناصر کاظمی کے دل کی اداسی درود یوار تک یادوں کی زلفوں کا سایہ لیے ہوئے چھا گئی۔

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر

اداسی بال کھولے سو رہی ہے (۳۰)

اس مضمون کے آخر میں مصنف بتاتے ہیں کہ ناصر کاظمی نے ہمیشہ اچھے دنوں کی امید رکھی ہے:

وقت اچھا بھی آئے گا ناصر

غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی (۳۱)

ناصر کاظمی کی شاعری سے متعلق یہ اہم مضمون شائع ہوا ہے۔ مذکورہ بالا تحقیقی جائزے کے بعد یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ "قومی زبان" میں اردو غزل کے فروغ کے لیے متعدد اہم مضامین شائع ہوئے ہیں۔ یہ تمام مضامین اردو ادب کے فروغ میں اہمیت کے حامل ہیں۔



حوالہ جات

- 1- رشید احمد صدیقی: "غزل، غالب اور حسرت" متعارف سید معین الرحمن، الو قار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۱۷
- 2- رفیع الدین ہاشمی: "اصناف ادب" سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۳۱
- 3- فرمان فتح پوری: "پیش لفظ" مشمولہ "بیسویں صدی میں اردو غزل" مرتبہ نیاز فتح پوری، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۵
- 4- عبد اللہ جاوید: "صبا کبر آبادی (ایک مطالعہ)" (مضمون) مشمولہ ماہنامہ "قومی زبان" جلد ۸۱، شمارہ ۲، جون ۲۰۰۹ء، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ص ۱۲-۱۳
- 5- ایضاً، ص 17
- 6- ایضاً، ص 17
- 7- ایضاً، ص 18
- 8- ایضاً، ص 18
- 9- ایضاً، ص 18
- 10- ایضاً، ص 18
- 11- ایضاً، ص 20
- 12- ایضاً، ص 20
- 13- ایضاً، ص 21
- 14- ایضاً، ص 21
- 15- ایضاً، ص 21
- 16- ایضاً، ص 16
- 17- ڈاکٹر ثار احمد فیض: "قتیل شغالی کی بے باک غزل گوئی" (مضمون) مشمولہ ماہنامہ "قومی زبان" جلد ۷۰، شمارہ ۱۰، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، اکتوبر ۱۹۹۸ء، ص ۵۱
- 18- ایضاً، ص 52
- 19- ایضاً، ص 52
- 20- ایضاً، ص 54

- 21- ایضاً، ص 54
 22- ایضاً، ص 54
 23- ایضاً، ص 54
 24- شامکہ یاسمین: ”ناصر کاظمی کی غزلیات کے مقطعوں کا جائزہ“ (مضمون) مشمولہ ماہنامہ ”قومی زبان“ جلد 81، شماره 2، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، جون 2009ء، ص 52
 25- ایضاً، ص 52
 26- ایضاً، ص 52
 27- ایضاً، ص 52
 28- ایضاً، ص 53
 29- ایضاً، ص 54
 30- ایضاً، ص 54
 31- ایضاً، ص 54



Roman Havalajat

1. Rashid Ahmed Siddiqui: “Ghazal, Ghalib and Hasrat” edited by Syed Moinur Rahman, Al-Waqar Publications, Lahore, 1995, p. 17
2. Rafiuddin Hashmi: “Asanaf-e-Adab” Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2003, p. 31
3. Farman Fatehpuri: “Foreword” included in “Urdu Ghazal in the Twentieth Century” edited by Niaz Fatehpuri, Urdu Academy Sindh, Karachi, 1987, p. 5
4. Abdullah Javed: “Saba Akbarabadi (A Study)” (Article) included in the monthly magazine “Qaumi Zaban” Volume 81, Issue 2, June 2009, Anjuman Tarqi Urdu Pakistan, Karachi, pp. 12-13
5. Ibid, p. 17
6. Ibid, p. 17
7. Ibid, p. 18
8. Ibid, p. 18
9. Ibid, p. 18
10. Ibid, p. 18
- 11 Ibid, p. 20
12. Ibid, p. 20
13. Ibid, p. 21
14. Ibid, p. 21
15. Ibid, p. 21
16. Ibid, p. 16
17. Dr. Nisar Ahmed Faiz: “Qateel Shifai’s Bold Ghazal Recitation” (Article) included in the monthly magazine “Qaumi Zaban” Volume 70, Issue 10, Anjuman Tarqi Urdu Pakistan, Karachi, October 1998, p. 51
18. Ibid, p. 52
19. Ibid, p. 52
20. Ibid, p. 54
21. Ibid, p. 54
22. Ibid, p. 54
23. Ibid, p. 54

24 Shumaila Yasmin: “A Review of Sections of Nasir Kazmi’s Ghazals” (Article) included in the monthly magazine “Qaumi Zaban” Volume 81, Issue 2, Anjuman Tarqi Urdu Pakistan, Karachi, June 2009, p. 52

25. Ibid, p. 52

26. Ibid, p. 52

27. Ibid, p. 52

28. Ibid, p. 53

29. Ibid, p. 54

30. Ibid, p. 54

31. Ibid, p. 54